مصارفِ زکوٰۃ

اور

عصر حاضر (اکیسویں صدی عیسوی) میں

مصالح اُمّت محمدیؐ

انجینئر مختار حسین فاروقی کی تحریر پر ایک تنقیدی جائزہ

تحریر: راشد یار خان

تمہید:

گزشتہ سو سال میں بعض اہل علم کی طرف سے ''فی سبیل اللہ'' کو عام قرار دینے والے ''قولِ شاذ'' کی نہ صرف بھرپور تلقین ہوتی رہی ہے بلکہ ''فی سبیل اللہ'' کو عام کر دینے کی پرزور وکالت کے ساتھ ساتھ علماء اور مفتیانِ کرام کو مشورہ بھی دیا جاتا رہا ہے کہ وہ ان کی گزارشات کی روشنی میں اپنے فتویٰ میں تبدیلی اور اصلاح کر لیں، یعنی فی سبیل اللہ کے عام ہونے اور تملیک کی شرط ختم ہونے کا فتویٰ دے دیں۔

''حکمت قرآن'' کے ماہِ اپریل کے شمارے میں محترم مختار حسین فاروقی صاحب کی تحریر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ گو کہ اس تحریر کا انداز مسئلہ کو کسی ایک جانب ثابت کرنے کا نہیں بلکہ صاحب مضمون نے آج کے اس رو بہ زوال اسلامی معاشرے میں انفاق کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں میں انفاق کی کم سے کم درجہ میں واحد صورت زکوٰۃ ہی باقی رہ گئی ہے لہٰذا عصر حاضر میں اس مقصد کے حصول کے لئے اسی کا سہارا لیا جائے اور سورۃ التوبہ کی آیہ ۶۰ میں مذکورہ مدّوں میں سے ایک مدّ ''فی سبیل اللہ'' کے تحت زکوٰۃ کو عموم دے کر مصالح محمدی میں خرچ کیا جائے۔ مذکورہ

مضمون میں شریعت کے کسی مسئلہ میں مشورہ دینے اور فتویٰ طلب کرنے کا انداز بالکل نیا اور بڑا دلفریب ہے' بالخصوص تعبدی امور کے مسائل میں جن پر اُمت ۱۴۰۰ سال سے عمل پیرا ہے' صرف حالات کا دکھڑا سنا کر اور مرورِ زمانہ کو دلیل بنا کر ان میں تبدیلی کرنے کی سفارش کرنا اور شریعت کے اصل اور بنیادی ماخذات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے لغوی تحقیق پر اکتفا کرنا نہ صرف اس مسئلہ بلکہ ہر شرعی مسئلہ میں گمراہی کے بے شمار دروازے کھول دے گا۔

زکوٰۃ کے مصرف ''فی سبیل اللہ'' کے حوالے سے میں اپنی گزارشات مع دلائل پہلے ہی انجمن اور تنظیم کے اکابرین تک تحریراً پیش کر چکا ہوں' لیکن ''حکمت قرآن'' میں فاروقی صاحب کی تحریر میں کچھ باتیں خلافِ حقیقت ہیں جن کی وجہ یقیناً کچھ مغالطے ہی ہوں گے۔ ان کی حقیقت بیان کرنا بھی میری ذمہ داری ہے اور اس تحریر کا تجزیہ کرنا بھی اس لئے نہایت ضروری ہے کہ محترم فاروقی صاحب نے جو دلنشین طرزِ استدلال اپنایا ہے وہ کم از کم شرعی مسائل میں نہایت مہلک ثابت ہوسکتا ہے' کیونکہ اس طرز استدلال کو اگر اصولی طور پر مان لیا جائے تو نہ صرف شریعت کا تیا پانچا ہو جائے گا بلکہ تقریباً روزانہ ہی علماء اکرام اور مفتیانِ عظام کو شریعت میں تبدیلی کی پرزور سفارش کا سامنا کرنا پڑے گا اور اگر وہ نہ مانے تو کم از کم یہ الزام تو اُن کے سر لگ ہی جائے گا کہ علماء عصر حاضر کے علوم اور تقاضے نہیں سمجھتے اور یہ کہ مصالح اُمتِ محمدی حاصل کرنے میں آج سب سے بڑی رکاوٹ خود علماء ہی ہیں۔

سب سے پہلے ان خلافِ حقیقت باتوں کا جائزہ لے لیا جائے جن کا تذکرہ میں نے تمہیدی امور میں کیا ہے۔

خلافِ حقیقت باتوں کی حقیقت

پہلی خلافِ حقیقت بات:

محترم فاروقی صاحب کی تحریر میں پہلی خلافت حقیقت بات ''صورت مسئلہ'' کے عنوان سے ہے جو صفحہ ۲۶ پر آئی ہے۔ دوسرے پیراگراف میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اس تغیر کی مثال یہ ہے کہ خیر القرون کے قریب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ مزارعت حرام ہے' تاہم چند عشروں کے فرق کے ساتھ حالات بدلے تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے مشروط مزارعت کے جواز کی رائے دی۔ ہم ظاہراً اسے اختلاف کا رنگ دیتے ہیں کہ شاگرد نے استاد سے

اختلاف کیا' حقیقتاً یہ ظروف واحوال کی تبدیلی کی وجہ سے اجتہاد کا نتیجہ تھا''۔

اس تحریر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے تو امام ابو یوسفؒ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کی رائے سے متفق تھے مگر تیں چالیس سال بعد تغیر حالات کی وجہ سے انہوں نے اپنی رائے بدل دی اور جواز کا فتویٰ دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے مزارعت کو حرام قرار دیا تو دلائل شرعیہ کی بنیاد پر دیا اور امام ابو یوسفؒ نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا اور اپنے استاد سے اختلاف کیا تو اس کے لئے انہوں نے احادیث رسول ﷺ سے دلائل دیئے۔ ان کے جواز کا فتویٰ احادیث صحیحہ کی بنیاد پر ہے نہ کہ چند عشروں کے بدلے ہوئے حالات کے فرق کی وجہ سے۔

دوسری خلاف حقیقت بات:

اسی صفحہ نمبر ۲۶ میں متصل بعد محترم فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

''اسی طرح حدیث میں تصریحاً ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد غازی فی سبیل اللہ ہے۔ فقہاء نے اس حدیث کو عموم پر قیاس کیا اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں غازی کے علاوہ دوسرے اشخاص کو بھی شامل کر دیا۔ یہ اجتہاد 'فی سبیل اللہ' کے لفظ میں عموم پر دلالت کرتا ہے کہ حالات کے بدلنے سے فی سبیل اللہ کے معنی میں موقع اور محل کی مناسبت سے اسلام کی cause اور سر بلندی کے لئے ہر مساعی کو لیا جانا چاہئے۔''

جیسا کہ محترم فاروقی صاحب نے لکھا کہ حدیث میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد ''غازی فی سبیل اللہ'' ہے۔ یہ ہم کیسے تسلیم کریں کہ امام ابو یوسفؒ نے ایک مسئلہ میں حدیث سے صراحت ہو جانے کے بعد اس میں قیاس یا اجتہاد کیا؟ کیونکہ امام ابو یوسفؒ کو کم از کم اتنا تو معلوم ہی ہوگا کہ اجتہاد یا قیاس ان امور میں کیا جاتا ہے جن کا علم قرآن وسنت سے صراحت کے ساتھ نہ ہو رہا ہو اور حدیث کے ہوتے ہوئے اجتہاد یا قیاس صرف اس صورت میں کیا جاتا ہے جب احادیث ہی میں ایک مسئلہ کے بارے متضاد باتیں آ رہی ہوں' تو پھر پہلے تطبیق کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے اور تطبیق بھی نہ ہو رہی ہو تو ترجیح کا اصول اپنایا جاتا ہے۔ قیاس یا اجتہاد کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حدیث پر عمل کرنا ممکن ہی نہ ہو۔ اور ظاہر ہے اس مسئلہ میں یہ سب باتیں نہیں تھیں اور پھر اُن کے استاد امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول بھی یقیناً ان کے سامنے رہا ہوگا کہ ''میری بات کے سامنے قولِ رسول ﷺ

پاؤ تو میری بات کو دیوار پر دے مارو"۔ رہی بات امام محمدؒ کی کہ وہ اس میں حاجیوں کو بھی شامل کرتے ہیں تو ان کے قول کی بنیاد بھی حدیث رسول ﷺ ہی ہے کہ ایک شخص نے اپنا اونٹ اللہ کی راہ میں صدقہ کیا تو اسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس پر حج کرنے والے کو سوار کرو۔ مولانا عتیق احمد قاسمی اپنی کتاب "زکوٰۃ کے مصارف" میں لکھتے ہیں کہ "فی سبیل اللہ" کا مصداق متعین کرنے کے بارے میں عہد صحابہ سے لے کر سینکڑوں سال تک دو ہی رائیں رہی ہیں۔ جمہور اُمت میں ہر عہد میں "فی سبیل اللہ" کا مصداق صرف مجاہدین کو سمجھا گیا لیکن عہد صحابہؓ سے لے کر دورِ حاضر تک تقریباً ہر عہد میں کچھ لوگ ایسے بھی رہے جنہوں نے مجاہدین کے ساتھ حاجیوں کو بھی "فی سبیل اللہ" کا مصداق قرار دیا۔ یہی دو رائیں فی سبیل اللہ کے بارے میں مقبول و مروّج رہیں اور انہی پر اُمت مسلمہ کا اجماع ہے، یعنی تیسری کسی تفسیر کے نہ ہونے پر۔

تیسری خلافِ حقیقت بات بوجہ مغالطہ:

تحریر کے صفحہ نمبر ۳۸ پر محترم فاروقی صاحب اجتہادی رائے کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں: "اگر امام ابو یوسفؒ نے زکوٰۃ کی رقم سے راستوں اور پلوں کی تعمیر پر خرچ کرنے کی اجازت دی ہے تو صحیح ہے"۔

امام ابو یوسفؒ سے منسوب اس بات کی وضاحت شروع ہی سے علماء احناف نے اپنی کتب میں کی ہے اور امام ابو یوسفؒ کا صحیح قول اپنی تفاسیر اور فقہی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ جیسے علامہ آلوسیؒ اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

'فی سبیل اللّٰہ' ارید بذلک عند ابی یوسفؒ من قطع الغزوات

(روح المعانی، ج ٤، ص ١٢٣)

"امام ابو یوسف کے نزدیک فی سبیل اللہ سے مراد قافلہ سے بچھڑے ہوئے غازی ہیں۔"

اسی طرح مولانا عتیق احمد قاسمی اپنی کتاب "زکوٰۃ اور مسئلہ تملیک" کے صفحہ ۶۳ پر لکھتے ہیں:

"ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج میں مصارف صدقات کا بیان کرتے ہوئے ایک جملہ یہ آیا ہے:

"وسهمه فی اصلاح طرق المسلمين " (کتاب الخراج، ص ٨١)

"ایک حصہ مسلمانوں کے راستے کی مرمت کے لئے۔"

مگر اس جملہ کی صحت اس لئے مشتبہ ہے کہ اول تو اس میں اصلاح طرق کو ایک مستقل

سہم قرار دیا، حالانکہ قرآنی تصریح کے مطابق یہ ان آٹھ سہام سے نہیں جو قرآن میں مذکور ہیں۔ یہ ممکن تھا کہ اس کو فی سبیل اللہ کے عموم میں داخل فرماتے مگر خود امام یوسفؒ سے ''مبسوط سرخسی'' میں اس کے خلاف یہ منقول ہے کہ لفظ فی سبیل اللہ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے اگرچہ عام ہے اور تمام قربات اور طاعات کو شامل ہے لیکن عرف میں اس کو جہاد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لئے آیت میں بھی وہی معنی مراد لئے جائیں گے۔ (مبسوط سرخسی، جلد۳، صفحہ۱۰)

چوتھی خلافِ حقیقت بات:

مندرجہ بالا بات ہی کو صفحہ نمبر ۴۸ پر محترم فاروقی صاحب نے اس طرح تحریر کیا:

''رسول اللہ ﷺ کے دور مبارک کے بعد اِن الفاظ کا مصداق غازی سے بڑھا کر حاجی اور دیگر امور خیر کو بھی محیط سمجھا گیا تھا تو آج ہزار سال بعد تغیر حالات کے پیش نظر سبیل اللہ کی تشریح اور مصداق کو ازسرنو کیوں متعین نہیں کیا جاسکتا''۔

گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے کہ فی سبیل اللہ کا مصداق غازی بھی آپ ﷺ کی حدیث سے معین ہوا اور اس کا مصداق ''حاجی'' بھی آپ ﷺ کی حدیث سے سمجھا گیا۔ جبکہ دیگر امور خیر کو اس میں کبھی بھی محیط نہیں سمجھا گیا۔

اور جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ''آج ہزار سال بعد تغیر حالات کے پیش نظر سبیل اللہ کی تشریح اور مصداق کو ازسرنو کیوں متعین نہیں کیا جاسکتا'' تو اس کا جواب قرآن پاک خود دیتا ہے۔

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (المائدۃ: ۳)

''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کرلیا ہے۔''

﴿وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَ یَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا﴾ (النساء: ۱۱۵)

''مگر جو شخص رسولؐ کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہل ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآں حالیکہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو، تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔''

پانچویں خلاف حقیقت بات:

صفحہ نمبر ۴۸ پر محترم فاروقی صاحب نے تحریر کیا کہ:

''اگر دیگر ائمہ نے ''فی سبیل اللہ'' کے مفہوم کو غزوات اور قتال سے عموم دے کر دشمن کے خلاف تیاری کے سلسلے میں تمام اقدامات کو شامل کر دیا ہے تو یہ بھی اتنا ہی درست ہے''۔

میں پہلے بھی تحریر کر چکا ہوں کہ تقریباً تمام ہی ائمہ کا اس پر اجماع ہے کہ ''فی سبیل اللہ'' کے مصداق مجاہدین ہیں اور کچھ کے نزدیک اس میں حاجی بھی شامل ہیں' لیکن تیسرے کسی قول کے نہ ہونے پر اجماع ہے' اور یہ ائمہ ہیں امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ امام مالکؒ امام احمد بن حنبلؒ امام ابو یوسفؒ امام محمدؒ۔ دشمن کے خلاف عسکری تیاری کے حوالے سے یہ تمام ائمہ متفق ہیں' مگر اس کے علاوہ کسی اور قسم کی تیاری کے بارے میں ان فقہاء میں سے کسی کا کوئی قول موجود نہیں۔ ہمارے ایک اور ساتھی کو امام رازیؒ' امام طبریؒ اور امام ابن امیرؒ کے حوالے سے مغالطہ ہو گیا ہے۔ ان کے اقوال بھی میں تحریر کر دیتا ہوں' کیونکہ ہوسکتا ہے محترم فاروقی صاحب کو بھی ان ہی کی ایک تحریر سے مغالطہ ہوا ہو۔

۱) امام رازیؒ تفسیر کبیر' ج ۱۵' ص ۱۱۳ میں اس بارے میں لکھتے ہیں:

قال المفسرون يعني الغزوات

۲) علامہ ابن جریر طبری جامع البیان فی تفسیر القرآن میں لکھتے ہیں:

واما قوله و في سبيل الله فانّه يعني و في النفقة في نصرة دين الله وطريقة وشريعة التي شرعها لعبادة بقتال اعدائه وَ ذٰلک هو غزو الكفار (ج٦' ص ١١٤)

''**واما قوله و في سبيل الله**'' سے ان کی مراد اللہ تعالیٰ کے دین وشریعت کی نصرت میں خرچ کرنا اور شریعت کے اس راستے پر خرچ کرنا جو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لئے مشروع فرمایا ہے اس کے دشمنوں سے قتال کی صورت میں اور یہی کفار کے ساتھ جہاد ہے''۔

۳) امام ابن اثیرؒ ''فی سبیل اللہ'' کے لغوی معنی بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ مطلقاً اس لفظ کا استعمال جہاد پر ہوتا ہے اور اس معنی میں یہ لفظ اس کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ اس کا مفہوم جہاد ہی مقصود ہونے لگا۔ (فقہ الزکاۃ' جلد دوم' ص ۱۲۵)

چھٹی خلاف حقیقت بات:

''ایک عمومی تاثر'' کے عنوان سے محترم فاروقی صاحب نے ایک عام دیندار اور مذہبی آدمی کے غلط تاثر کو بیان کیا ہے کہ وہ صرف مدارس ہی کو زکوٰۃ دینا صحیح سمجھتا ہے اور اس تاثر کی رو سے دوسری جگہ زکوٰۃ خرچ کرنے والے کو یہ سمجھتا ہے کہ یہ لوگ ''مَنْ شذّ شذّ فی النّار'' کے مصداق اپنے لئے جہنم کا راستہ آسان کر رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ایسا ہرگز نہیں' عام طور پر جو میرا مشاہدہ ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے والے زیادہ سے زیادہ دس فیصد لوگ ہوتے ہیں جو اِن مدارس کو زکوٰۃ دیتے ہیں' باقی تقریباً ۹۰ فیصد لوگ مختلف فلاحی اداروں' ہسپتالوں' ایدھی فاؤنڈیشن' جہادی تنظیموں' برادری کی انجمنوں یا اپنے طور پر غریب رشتہ داروں اور جاننے والوں کو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔[1] علوم دین اور علماء سے محبت رکھنے والے یقیناً کچھ دیندار اور مذہبی لوگ مدارس کے لئے زکوٰۃ کی ادائیگی کی ترغیب وتشویق دلاتے ہیں مگر ایسا ہرگز نہیں کہ وہ باقی ۹۰ فیصد زکوٰۃ ادا کرنے والوں کو ''مَنْ شَذَّ شَذَّ فِي النَّارِ'' کا مصداق قرار دیتے ہوں۔ اس کا مصداق تو صرف انہیں سمجھا جاسکتا ہے جو قرآن وسنت کو چھوڑ کر اپنے لئے کوئی نئی راہ تلاش کریں۔

بقیہ تحریر کا تنقیدی جائزہ

صاحب مضمون کو علماء سے شکایت:

صفحہ نمبر ۲۸ کے دوسرے پیراگراف میں لکھتے ہیں:

> ''ہمارے عام دینی طبقے کے لوگ اور علماء بھی گزشتہ چند صدیوں کے علماء ومجتہدین کا ذکر کرتے ہیں تو ایک لفظ متاخرین کہہ کر ایک درجے میں استخفاف کرتے ہوئے اس رائے کو ناقابل التفات گردانتے ہیں' حالانکہ بدلے ہوئے حالات میں اگر رائے اور احکام بدل جائیں تو اسی کو اجتہاد کہتے ہیں''۔

اسی طرح سے صفحہ نمبر ۳۷ کے آخری پیراگراف میں لکھتے ہیں:

> ''اسی سلسلے میں ہمارے متاخرین فقہاء ہیں جنہوں نے حالات کے حد درجہ تغیر کی بنا پر اسلاف کی آراء سے اختلاف کیا اور مخلصانہ اجتہاد کیا' مگر عام طور پر اسے متاخرین کی رائے کہہ کر نہ صرف متاخرین کے متاخرین اس کو رد کر دیتے ہیں بلکہ اسلام کے

نوٹ: یہ اندازہ صرف میرے مشاہدے کی بنیاد پر ہے یہ تناسب کم یا زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔

اصولِ اجتہاد کی جڑ کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں''۔

استخفاف کرتے ہوئے نا قابلِ التفات ہونے کی وجہ ''متاخرین'' یا سلف ہونا قطعاً نہیں' بلکہ ان کی رائے کا شرعی اعتبار سے مدلل نہ ہونا ہے۔ محض ''رائے'' ہمیشہ نا قابلِ التفات رہی ہے اور رہے گی۔ اور جو رائے (شرعی معاملے میں) قرآن و حدیث اور اجماع سے مدلل ہوگی وہ محض رائے نہ رہے گی' بلکہ اجتہاد بن جائے گی اور دینی حجت بن جائے گی۔ اس کی سب سے بڑی مثال خود امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ ان کی اپنی رائے نماز کے حوالے سے یہ تھی کہ جب تک عربی نہ سیکھ لے نماز فارسی میں پڑھ کر ادا ہو جاتی ہے' مگر ان کی یہ رائے مدلل نہ ہونے کی وجہ سے شروع دن سے نا قابلِ التفات رہی ہے۔

اور زیرِ بحث مسئلہ میں متاخرین کی رائے کو استخفاف کرتے ہوئے نا قابلِ التفات اس لئے جانا جا رہا ہے کہ مسئلہ شریعت کا ہے اور ان کی رائے کے حق میں کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ اور یہ بات بھی سمجھ لی جائے کہ مسئلہ نہ ''سلف'' ہونے کا ہے نہ ''متاخرین'' ہونے کا' بلکہ اس کے لئے تو سادہ سا اصول ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد کوئی شخص بھی اپنی ذات میں تو حجت ہے نہیں' لہٰذا کوئی بھی ہو' چاہے اس کا تعلق ائمہ اربعہ کے زمانے سے ہو یا خود ائمہ اربعہ میں سے کوئی ہو' یا آج کے دور کا کوئی عالم ہو' اگر اس کی رائے ماخذاتِ شریعت سے مدلل نہیں ہوگی' محض رائے ہوگی تو وہ ردّ کر دی جائے گی۔

اور صاحبِ تحریر نے جو یہ لکھا ہے کہ ''بدلے ہوئے حالات میں اگر رائے اور احکام بدل جائیں تو اسی کو اجتہاد کہتے ہیں'' ایسا ہرگز نہیں۔ شریعت کے جو احکام (خصوصاً تعبدی امور میں) ایک مرتبہ ثابت ہو چکے ہوں بدلے ہوئے حالات میں وہ نہیں بدلتے۔ اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے تو پھر آپ کو ان نو مولود مجتہدین کی بات بھی مان لینی چاہیے جو سود کے حوالے سے اسی قسم کا اجتہاد کرتے ہیں۔

اور جنہیں صاحبِ تحریر یہ الزام دیتے ہیں کہ اسلام کے اصولِ اجتہاد کی جڑ کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو بارہ بارہ چودہ چودہ سال یہی فقہ اور اجتہاد ہی پڑھتے ہیں اور یہ علماء ''اصولِ اجتہاد'' کی نہیں ایسے نو مولود مجتہدین کی جڑ کاٹتے ہیں۔

زکوٰۃ کی نوعیت اور معاملات:

صفحہ نمبر ۲۶ پر ''صورتِ مسئلہ'' کے تحت محترم فاروقی صاحب نے لکھا:

''زکوٰۃ جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی کی نوعیت اور معاملات دَورِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ

والسلام میں کیا تھے؟ دور خلافت راشدہ میں کیا تھے؟ اور اس کے فوراً بعد جو دور آیا جس میں دور بنوامیہ اور دور بنوعباس کا ابتدائی زمانہ شامل ہے اس میں یہ معاملات اور ان پر اہل علم فقہاء امت کا نقطہ نظر کیا تھا؟ کیا ان تینوں ادوار میں یہ معاملات ہو بہو ایک جیسے رہے یا ان میں مرور زمانہ سے کوئی تبدیلی آئی؟ مزید برآں آج جو حالات......''

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے کہ ''زکوٰۃ جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی کی ''نوعیت'' کیا تھی تو اس کے لئے عرض یہ کرنا ہے کہ:

۱) یہ ارکانِ دین میں سے ایک عبادت ہے اور ہر صاحب نصاب پر اس کا ادا کرنا فرض ہے۔

۲) زکوٰۃ کا لینا کس کو جائز ہے؟ تو قرآن وحدیث سے قطعیت کے ساتھ ثابت ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۶۰ میں جو شخص بھی اِن آٹھ مدوں کے تحت ضرورت مند ہوگا صرف انہی کو زکوٰۃ دی جائیگی۔

۳) ان مدوں میں اب کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔ ہاں' کسی زمانے میں کسی مد کا محل نہ ہونے کی وجہ سے اس دور یا اس کے زمانے کے لئے وہ مد' محل نہ ہونے کی وجہ سے' ساقط رہے گی۔

۴) اور ان مدوں کی تفسیر آپ ﷺ کی احادیث' تعامل صحابہ وتابعین اور اجماع ائمہ اربعہ سے ہو جانے کے بعد اور اس اجماع پر ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد کوئی نئی تفسیر بغیر کسی دلیل وحجتِ قطعی کے شرعاً نہیں کی جاسکتی۔

یہ تو تھی زکوٰۃ جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی کی ''نوعیت''۔

اب دوسری بات ''معاملات'' کے حوالے سے صاحب تحریر نے فرمائی۔ جہاں تک میں اس کو سمجھا ہوں کہ اس سے مراد کیا ہے۔

۱) زکوٰۃ کے جمع کرنے اور تقسیم کرنے کا نظام آپ ﷺ کے دور میں کیا تھا؟

۲) جن سے زکوٰۃ لی جاتی تھی ان کے حالات کیا تھے؟

۳) جنہیں زکوٰۃ دی جاتی تھی ان کے حالات کیا تھے؟

۴) وقت کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ وصول کرنے کے نظام اور ادا کرنے کے نظام میں کیا تبدیلی واقع ہوئی؟

۵) جن سے زکوٰۃ لی جاتی تھی اور جنہیں دی جاتی تھی مرور زمانہ کے ساتھ ان لوگوں کے حالات میں کیا تغیر آیا؟

غالباً انہی حوالوں سے محترم فاروقی صاحب نے ایک تاریخی جائزہ پیش کیا ہے تو اس

حوالے سے (یعنی معاملات کے حوالے سے) آپ ﷺ نے کوئی قید ویسے بھی نہیں رکھی' حالات کے مطابق زکوٰۃ کے معاملات' جیسی سہولت ہو چلائے جاسکتے ہیں۔لہٰذا اس حوالے سے تو میں محترم فاروقی صاحب سے بالکل متفق ہوں کہ ''معاملات'' کے حوالے سے اجتہاد کر کے آج کے دور کے حساب سے زکوٰۃ کے جمع کرنے اور تقسیم کرنے کا نیا نظام ہونا چاہئے۔مگر زیر بحث مسئلہ ''نوعیت'' کے تحت آئے گا ''معاملات'' کے تحت نہیں۔

تاریخی حقائق کا جائزہ اور حضرت عثمانؓ کے دور میں اموالِ زکوٰۃ کی تقسیم:

پھر صفحہ نمبر ۲۹ سے ۳۳ تک محترم فاروقی صاحب نے تاریخی حقائق کا ایک جائزہ پیش کیا۔اس پورے جائزے میں انہوں نے اصلاً صرف ایک تبدیلی کا ذکر کیا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اموال زکوٰۃ کے حوالے سے ہوئی۔ہمیں یہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ اس کا تعلق کس طرح کا بنتا ہے۔

۱) کیا حضرت عثمانؓ نے زکوٰۃ کی مدوں میں کوئی تبدیلی کی؟
۲) کیا حضرت عثمانؓ نے زکوٰۃ کی مدوں کی کوئی علیحدہ توضیح وتشریح یا تفسیر بیان کی؟
۳) زکوٰۃ ادا کرنے والوں پر زکوٰۃ کب واجب ہوتی ہے' کیا اس بارے میں کوئی تبدیلی کی؟
۴) زکوٰۃ کس طرح کے مال پر فرض ہے اور کس طرح کے مال پر فرض نہیں ہے' کیا اس میں کوئی تبدیلی کی؟
۵) کیا زکوٰۃ کی کسی مد کے محل کے ہوتے ہوئے بھی کسی مد کو ساقط کیا؟

یقیناً آپ سب کا جواب بھی اس بارے میں یہی ہوگا کہ نہیں' ایسا کچھ نہیں کیا' مگر آپؓ کے دور میں اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی جو تقسیم ہوئی' آخر ہم اُسے کہاں منطبق کریں گے؟ میری رائے میں یہ تبدیلی محض انتظامی نوعیت کی تھی' جس کی بنیادی وجہیں دو ہی تھیں' ایک سلطنت اسلامیہ کی وسعت اور دوسرے سوشل ویلفیئر کے عادلانہ نظام کی موجودگی' اور میرے خیال میں اس انتظامی تبدیلی سے زکوٰۃ کے کسی شرعی حکم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور آج کے دور میں زکوٰۃ کے جمع کرنے اور تقسیم کرنے کے نظام میں علماء سے مشورے کے بعد مزید بہتری اور اموال زکوٰۃ کی مزید تقسیم بھی کی جاسکتی ہے' جیسے بینکوں میں موجود رقم' اموال تجارت' گھروں میں موجود مال یا اور بہت سے اموال کی نئی ظاہری صورتیں جو آج کے دور میں سامنے آئی ہیں۔واللہ اعلم!

ایک غلط تصور:

اسی ''تاریخی حقائق'' کے عنوان کے تحت (صفحہ ۳۱، جزو ۳) کے تحت محترم فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

> ''۳) زکوٰۃ باختلاف روایات ۵ سے ۹ ہجری کے درمیان فرض ہوئی ہے جس کے ذریعے ایک عام مسلمان کے لئے صدقات اور اللہ کے لئے قرضِ حسنہ کی ایک ناگزیر کم از کم مقدار اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمادی''۔

''صدقات'' کے حوالے سے تو محترم فاروقی صاحب کی بات صد فیصد درست ہے مگر ''قرضِ حسنہ'' تو اپنے نام سے بھی ظاہر ہے کہ اس کی کوئی کم از کم حد مقرر نہیں کی جاسکتی اور سلف صالحین کی تفاسیر سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ صدقات کی تو کم از کم حد زکوٰۃ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے مگر دینی نصرت و تائید اور قرض حسنہ کی نہ کوئی کم از کم حد ہے اور نہ زیادہ سے زیادہ کوئی حد۔ اس کے لئے تو ہمارے پیش نظر سنت کا وہ واقعہ رہنا چاہئے جب حضور ﷺ نے ایک صحابیؓ رسول کی لائی ہوئی چند کھجوروں کو بقیہ تمام صحابہؓ کے لائے ہوئے تمام مال پر پھیلا دیا تھا اور ان کھجوروں کو تمام مال پر بھاری قرار دیا تھا۔

باب الضّلال:

صفحہ نمبر ۴۲ اور ۴۳ پر محترم فاروقی صاحب نے کیمرے کی فوٹو کے بارے میں عالم عرب اور پاک و ہند و بنگلہ دیش کے طرز عمل کی تمثیل بیان کی ہے اور صفحہ ۴۳ پر رقم طراز ہیں کہ

> ''اب عملاً خلاف ورزی وہاں بھی ہے اور یہاں بھی اور نتیجہ دونوں آراء کا ایک ہی ہے، لیکن ہمارے ہاں کا عام مسلمان ذہنی خلفشار میں رہتا ہے اور وہاں کا مسلمان ذہنی سکون میں۔ یہی کیفیت ہوگی اس جواز کے فتویٰ کے بعد کہ موجودہ حیلہ کے طریق پر عمل درآمد سے بہر صورت اہلِ تقویٰ کے دل میں اضطراب کی کیفیت رہتی ہے جبکہ فتویٰ کے بعد زکوٰۃ کی رقم کا استعمال تو بہر حال وہی ضروریاتِ دینی ہی ہوں گی مگر اضطراب قلبی سے نجات ضرور میسر آجائے گی، اور یہ بہت بڑا فرق ہے''۔

محترم فاروقی صاحب کا یہ فلسفہ بھی محلِ نظر ہے۔ تحریر کے اس حصہ سے (فوٹو کے جائز یا ناجائز ہونے سے قطع نظر) جو میں سمجھا ہوں کہ جس گناہ کے کرنے میں اضطراب یا خلش محسوس ہو اُسے گناہ ہی نہ رہنے دو، بلکہ جائز کر دو تا کہ دل کی خلش بے چین ہی نہ کرے۔

میرے خیال میں تو کوئی حق گو مفتی "ضمیر کی خلش یا اضطراب" کو علت مان کر فتویٰ دے گا نہیں۔ ہاں! یورپ میں ایسے مفتی کثرت سے مل جائیں گے۔ کیوں کہ اہل یورپ نے Prostitution کو اسی فلسفہ کے تحت قانونی شکل دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ فطری تقاضا ہے اور لوگ ناجائز طریقے سے اس جنسی تقاضے کو پورا کرتے ہیں، مگر ایک احساس گناہ بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے شخصیت متاثر ہوتی ہے، شخصی کردار میں کمزوری پیدا ہوتی ہے اور شخصیت صحیح طور سے پروان نہیں چڑھتی۔ چنانچہ انہوں نے اسے قانونی شکل دے دی، لہٰذا اب وہاں یہ سب کرتے ہوئے کسی کو ضمیر کی خلش نہیں ہوتی اور نہ دل مضطرب ہوتا ہے۔ لہٰذا اب اس فلسفہ کی رو سے جب بھی کسی گناہ کی خلش کسی کو ستائے تو وہ یورپ کے مفتیوں سے اس کو جائز کروالے، کیوں کہ یہاں تو تاحال ایسے ممکن نہیں۔

صاحب تحریر کا علماء اور مفتیان عظام کو مشورہ:

محترم فاروقی صاحب نے صفحہ نمبر ۲۵ پر موجود ظروف واحوال میں علماء دین متین اور مفتیان عظام کو مشورہ دیتے ہوئے لکھا کہ وہ:

> "صرف مفتیٰ بہ قول (اور وہ بھی "مُلکاً عَاضًا" کے دور کا) نقل کر کے بھیج دینے کو کافی نہ سمجھیں تو مجھے اللہ تعالیٰ سے پوری امید ہے کہ وہ بھی اسی رائے تک پہنچیں گے کہ موجودہ دَور کے دین سے دُور عوام کے مسائل کو حکومتوں کے بے پناہ وسائل پر چھوڑ کر "صدقات" کی اس آمدنی کو اسلام کی بقا اور نشاۃِ ثانیہ کے لئے کام کرنے والے اداروں اور ان سے وابستہ اور ملحق افراد کی ضروریات کی کفالت تک محدود کر دینا چاہئے۔"

محترم فاروقی صاحب نے علماء دین متین و مفتیان عظام سے جو درخواست کی ہے میرے خیال میں تو یہ بے سود ہے۔ ہاں! اگر رسول اللہ ﷺ آج حیات ہوتے تو اس درخواست کا ان کے سامنے پیش کیا جانا حق بجانب تھا۔ ان علماء دین اور مفتیان عظام کو تو اس چیز کا اختیار ہی نہیں۔ رہی بات مفتیٰ بہ قول یا فتویٰ کی، تو اس سے مراد سائل کی یہ ہوتی ہے کہ مفتی یا عالم سائل کو اس کے پیش کردہ ظروف واحوال کے مطابق شریعت کا صحیح حکم بتائے اور شرعی حکم مدلل ہوتا ہے قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس سے، اگر شرعی حکم ان سے ثابت ہو جاتا ہے تو پھر خواہ حالات کیسے بھی ہوں کسی کو بھی اختیار نہیں کہ وہ ان سے ہٹ کر شریعت کے متوازی اپنی کوئی رائے دے اِلاّ یہ کہ شریعت نے ہی کوئی رعایت دی ہو۔ اس وقت تو باطل پوری کوشش میں ہے کہ مسلمان اپنی بنیادوں سے ہٹ کر دین کی نئی نئی تشریحات ان کی مرضی

کے مطابق کریں اوراس طرح اپنے مقاصد کواعلیٰ روح کے ساتھ حاصل نہ کرسکیں۔

ایک اور مشورہ:

اسی صفحہ ۲۵ کی آخری سطر میں محترم فاروقی صاحب رقمطراز ہیں کہ:

''اور جب تک علمائے حق اس بات پر متفق نہ ہوں کہ غرباء اور مساکین عوام کے لئے تو شاید امریکہ اور دجال کی طرف سے امداد آجائے' اور آرہی ہے' دین متین کی حفاظت اوراحیائے دین کے لئے کوششیں جو بالآخر جہاد وقتال کے مرحلے میں داخل ہوکر اسلام کوایک عالمی خلافت کی شکل دے سکتی ہیں' اس کے لئے یہی محدود وسائل اور اللہ تعالیٰ کی نصرت واعانت کے علاوہ کچھ بھی میسر نہیں''۔

علماء حق کو جس بات پر متفق ہونے کا مشورہ دیا گیا ہے وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے' کیونکہ اتنا تو ایک سیکولر سے سیکولر شخص بھی سمجھتا ہے کہ امریکہ اور دجال کو مسلمانوں کی غربت اور فقر سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ آج تک امریکہ اور دجال کی امداد سے کسی غریب اور مسکین کی غربت دور ہوئی۔ ان کی تو تمام پالیسیاں مسلمانوں کو مزید غریب بنانے کے لئے ہی ہوتی ہیں۔

اور فاروقی صاحب کا آخری جملہ:

''اس کے لئے یہی محدود وسائل اور اللہ تعالیٰ کی نصرت واعانت کے علاوہ کچھ بھی میسر نہیں''۔

میں سمجھتا ہوں کہ مندرجہ بالا جملہ تو ہماری ناشکری اور ناامیدی کا مظہر نظر آتا ہے۔ محمد ﷺ نے ساری جدوجہد کیا اسی مد کے بل بوتے پر کی تھی؟ اور کہاں ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کا اُسوہ؟ کیا انہوں نے اسی مدّ پر بھروسہ کرکے اقامت دین کا کام کیا تھا؟ میرے لئے تو یہ سوچنا بھی میری تحریک کی موت کے مترادف ہے۔

مادّہ پرست معاشرے کے اثرات:

''تطبیق'' کے عنوان سے محترم مختار حسین فاروقی صاحب نے صفحہ نمبر ۴۲ کے دوسرے پیراگراف میں تحریر کیا:

''اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا' عوام کی فلاح و بہبود کے منصوبے تو یو۔این۔او' امریکہ اور تمام حکومتیں اور این جی اوز کر ہی رہی ہیں۔ جس مقصد کے لئے کہیں سے امداد کی موہوم (remote) توقع بھی نہیں ہے وہ اسلام کی حفاظت و

سربلندی کا مقصد ہے' لہٰذا یہ صحیح اور برمحل بات ہے کہ' اسلام ہی اس دور میں سب سے زیادہ یتیم ہے۔''

مندرجہ بالا سطور کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی مادہ پرستانہ فکر نے نہ صرف عام لوگوں کو متاثر کیا بلکہ اچھے خاصے دینی فہم رکھنے والے بھی اس سے محفوظ و مامون نہ رہ سکے۔ ان سطور پر غور کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا سارا انحصار اسباب و وسائل پر ہے اور اللہ کی ذات کہیں پس منظر میں چلی گئی ہے یا اللہ تعالیٰ کے پاس بھی (معاذ اللہ) محدود وسائل ہیں' لہٰذا غریبوں اور مسکینوں کو تو مغربی این جی اوز کے حوالے کر دیا جائے تا کہ ہمارے وسائل میں کمی نہ آنے پائے۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نو میدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے!

جبکہ ایک عام آدمی بھی این جی اوز اور اقوام متحدہ کے مذموم مقاصد سے واقف ہے۔

''الخلق عیال اللّٰہ'' کے مصداق اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اپنی تمام مخلوق کا رازق ہے اور اس نے بھی مسلمانوں کے لئے ایک این جی او بنائی ہے جس کا رکن ہر مسلمان ہے اور وہ اپنے حلال مال سے ایسے ضرورت مندوں کے لئے ڈھائی فیصد رقم نکالتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ہی اللہ تعالیٰ کی اس این جی او کے دفتر پر تالا مارنے پر تلے بیٹھے ہیں۔

تنظیم اسلامی کی فکر سے متصادم:

اور رہی فاروقی صاحب کی یہ بات کہ ''اسلام ہی اس دور میں سب سے زیادہ یتیم ہے'' اسلام اللہ کا دین ہے اور اس دین کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے۔ یہ ''دین اللہ'' ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ دین یتیم ہو گیا ہے' یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب اس کی پرورش اور اس کو لازماً قائم کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ میرے خیال میں تو یہ سوچ تکبر کو جنم دینے والی سوچ ہے اور بانی تنظیم محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی دینی فکر سے متصادم ہے۔ بانی تنظیم محترم ڈاکٹر صاحب نے تو اپنے دروس و تقاریر میں یہی بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے' وہ چاہے تو ایک آن میں سب مسلمان ہو جائیں اور دین قائم ہو جائے ...... اور وہ کر کے بھی رہے گا' جیسا کہ اس نے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ مگر اللہ تعالیٰ ہماری آزمائش کرنا چاہتا ہے کہ کون اس کے دین کو قائم کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے اور

اپنا مال اور اپنی جان کھپاتا ہے (شریعت کی پابندی کرتے ہوئے)۔ ''اقامت دین'' تو ایک ذریعہ ہے' اصل مقصود تو رضائے الٰہی ہے۔ غلبہ دین تو اللہ تعالیٰ ہی کریں گے اور جب چاہیں گے کریں گے۔ بانی محترم فرماتے ہیں تم تو بس اللہ کے لئے اس کام میں اپنے آپ کو لگا دو' کھپا دو اور نحن انصار اللہ کا نعرہ بلند کرو۔ مگر ہرگز اپنے آپ کو اس کام کا ٹھیکیدار نہ سمجھنا چاہئے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اور نہ ہی اس کے رسول ﷺ نے کہیں فرمایا کہ تم اس دین کے ٹھکیدار بن جاؤ' اب تمہیں ہر حال میں اس دین کی عمارت قائم کرنی ہی ہے' اور اگر اس کے لئے تمہارے پاس جائز وسائل نہ ہوں تو ناجائز طریقے سے بھی وسائل لازماً حاصل کرو۔

تنظیم اسلامی کی فکر جو میں سمجھا ہوں اور امیر تنظیم کے ابتدائی امارت کے زمانے کی تقاریر میں بھی بنیادی تلقین یہی تھی کہ رضاءِ الٰہی اصل مقصود ہے۔ ہاں رضاءِ الٰہی مکمل طور سے حاصل اقامت دین کی جدوجہد کے ذریعے ہی ہوتی ہے مگر اپنے جائز اسباب و وسائل کے ساتھ' شریعت کی حدود و قیود میں رہتے ہوئے' اتباع رسول ﷺ کرتے ہوئے۔ اگر کہیں یہ فکر پس منظر میں چلی گئی اور اقامت دین کو اپنے اوپر مسلط کرلیا تو پھر ساری توانائیاں' صلاحیتیں اور وقت' اقامت دین کے لئے ضروری اسباب و وسائل ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرنے میں صرف ہو جائیں گے اور یوں ہم خود اپنی منزل سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ و مامون رکھے (آمین)

بقیہ: مسلمانوں کا نظامِ تعلیم

''اور وہ وقت یاد کرو جب کہ موسیٰؑ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میں (اس سفر میں) برابر چلتا رہوں گا یہاں تک کہ اس مقام پر پہنچ جاؤں جہاں دو دریا آپس میں ملتے ہیں یا یوں ہی زمانہ دراز تک چلتا رہوں گا۔''

ہر عالم کے اوپر ایک عالم ہے' اس لئے تعلیم دراصل عمر بھر کا مشغلہ ہے۔ اس کے لئے کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ عمر کی کوئی شرط نہیں ہے۔ ''انسان کا فرض ہے کہ وہ مہد سے لحد تک علم حاصل کرے''۔ یہ ہے تحصیل علم اور تدریس کا وہ طریقہ جس کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے لوگوں کو توحید کی تعلیم دی۔